جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

قادیانیت

نے

عالم اسلام کو کیا دیا

صرف ذہنی انتشار اور غیر ضروری مذہبی کشمکش

ہم کو ایک علمی اور حقیقت پسند انسان کے نقطۂ نظر سے تحریک قادیانیت کا تاریخی جائزہ لینا چاہیئے۔ اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید میں کونسا کارنامہ انجام دیا اور عالم اسلام کی جدید نسل کو کیا عطا کیا —؟ نصف صدی کی اس پُرشور اور ہنگامہ خیز مدت کا ماحصل کیا ہے؟ تحریک کے بانی نے اسلامی مسائل اور متنازع فیہ امور پر جو ایک وسیع و ضخیم کتب خانہ[۱] یادگار چھوڑا ہے۔ اور جو تقریباً ۷۰ برس سے موضوع بحث بنا ہُوا ہے۔ اس کا خلاصہ اور ماحصل کیا ہے؟ قادیانیت عصر جدید کے لئے کیا پیغام رکھتی ہے؟

ان سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لئے پہلے ہم کو اس عالم اسلامی پر ایک نظر ڈالنی چاہیئے۔ جس میں اس تحریک کا ظہور ہُوا اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس کی کیا حالت تھی اور اس کے کیا حقیقی مسائل و مشکلات تھے۔

اس عہد کا سب سے بڑا واقعہ جس کو کوئی مؤرخ اور کوئی مصلح نظر انداز نہیں کر سکتا، یہ تھا کہ اسی زمانہ میں یورپ نے عالم اسلام پر بالعموم اور ہندوستان پر بالخصوص یورش کی تھی۔ اس کے جلو میں جو نظام تعلیم تھا۔ وہ خدا پرستی اور خداشناسی کی روح سے عاری تھا۔ جو تہذیب تھی وہ الحاد اور نفس پرستی سے معمور تھی۔ عالم اسلام، ایمان، علم اور مادی طاقت میں کمزور ہو جانے کی وجہ سے اس تغیر و مسلح مغربی

۱؎ مرزا صاحب کی تصانیف کی تعداد ۸۰ سے کم نہیں ہے ان میں اکثر نہایت ضخیم اور کئی کئی جلدوں کی کتابیں ہیں۔

طاقت کا آسانی سے شکار ہو گیا۔ اس وقت مذہب میں (جس کی نمائندگی کے لئے صرف اسلام ہی میدان میں تھا۔) اور یورپ کی ملحدانہ اور مادہ پرست تہذیب میں تصادم ہوا۔ اس تصادم نے ایسے نئے سیاسی، تمدنی، علمی اور اجتماعی مسائل پیدا کر دئے جن کو صرف طاقتور ایمان، راسخ و غیر متزلزل عقیدہ، یقین، وسیع اور عمیق علم، غیر متزلزل اعتماد و استقامت ہی سے حل کیا جا سکتا تھا۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک طاقتور علمی و روحانی شخصیت کی ضرورت تھی۔ جو عالم اسلام میں روح جہاد اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر دے جو اپنی ایمانی قوت اور دعوتی صلاحیت سے دین میں ادنیٰ تحریف و ترمیم قبول کئے بغیر اسلام کے ابدی پیغام اور عصر حاضر کی بے چین روح کے درمیان مصالحت و رفاقت پیدا کر سکے اور شوخ و پرجوش مغرب سے آنکھیں ملا سکے۔

دوسری طرف عالم اسلام مختلف دینی و اخلاقی بیماریوں اور کمزوریوں کا شکار تھا۔ اس کے چہرہ کا سب سے بڑا داغ وہ شرک جلی تھا۔ جو اس کے گوشہ گوشہ میں پایا جاتا تھا۔ قبریں اور تعزیے بے محابا پوج رہے تھے۔ غیر اللہ کے نام کی صاف صاف دہائی دی جاتی تھی۔ بدعات کا گھر گھر چرچا تھا۔ خرافات اور توہمات کا دور دورہ تھا۔ یہ صورت حال ایک ایسے دینی مصلح اور داعی کا تقاضا کر رہی تھی جو اسلامی معاشرہ کے اندر جاہلیت کے اثرات کا مقابلہ اور مسلمانوں کے گھروں میں اس کا تعاقب کرے جو پوری وضاحت اور جرأت کے ساتھ توحید و سنت کی دعوت دے اور اپنی پوری قوت کے ساتھ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ کا نعرہ بلند کرے۔

اسی کے ساتھ بیرونی حکومت اور مادہ پرست تہذیب کے اثر سے مسلمانوں میں ایک خطرناک اجتماعی انتشار اور افسوس ناک اخلاقی زوال رونما تھا۔ اخلاقی انحطاط فسق و فجور کی حد تک تعیش و اسراف نفس پرستی کی حد تک حکومت و اہل حکومت سے مرعوبیت ذہنی غلامی اور ذلت کی حد تک مغربی تہذیب کی نقالی اور حکمران قوم (انگریز) کی تقلید کفر کی حد تک پہنچ رہی تھی۔ اس وقت ایک ایسے مصلح کی ضرورت تھی جو اس اخلاقی و ذہنی انحطاط کی بڑھتی ہوئی رو کو روکے اور اس خطرناک رجحان کا مقابلہ کرے جو محکومیت و غلامی کے اس دور میں پیدا ہو گیا تھا۔

تعلیمی و علمی حیثیت سے حالت یہ تھی کہ عوام اور محنت کش طبقہ دین کے مبادیٔ اولیات سے ناواقف اور دین کے فرائض سے بھی غافل تھا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ شریعت اسلامی، تاریخ اسلام اور اپنے ماضی سے بے خبر اور اسلام کے مستقبل سے مایوس تھا۔ اسلامی علوم روبہ زوال اور پرانے تعلیمی مرکز عالم نزع میں تھے۔ اس وقت ایک طاقتور تعلیمی تحریک اور دعوت کی ضرورت تھی۔ نئے مکاتب و مدارس

کے قیام، نئی اور مؤثر اسلامی تصنیفات اور نئے سلسلۂ نشر و اشاعت کی ضرورت تھی جو امت کے مختلف طبقوں میں مذہبی واقفیت، دینی شعور اور ذہنی اطمینان پیدا کرے۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر عالم اسلام کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ انبیاء علیہم السلام کے طریق دعوت کے مطابق اس امت کو ایمان اور عمل صالح اور اس صحیح اسلامی زندگی اور سیرت کی دعوت دی جائے جس پر اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت، دشمنوں پر غلبہ اور دین و دنیا میں فلاح و سعادت اور سربلندی کا وعدہ فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام کی ضرورت دین جدید نہیں ایمان جدید ہے۔ کسی دور میں بھی اس کو نئے دین اور نئے پیغمبر کی ضرورت نہیں تھی۔ دین کے ان ابدی حقائق، عقاید اور تعلیمات پر نئے ایمان اور نئے جوش کی ضرورت تھی جس سے زمانہ کے نئے فتنوں اور زندگی کی نئی ترغیبات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

زندگی کے ان شعبوں اور ضرورتوں کے لئے جن کا اوپر تذکرہ ہوا، عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں مختلف شخصیتیں اور جماعتیں سامنے آئیں، جنھوں نے بغیر کسی دعوے اور بغیر امت سازی کی کوشش کے وقت کی ان ضرورتوں اور مطالبوں کو پورا کیا اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ انہوں نے کسی نئے مذہب اور کسی نئی نبوت کا علم بلند کیا اور نہ مسلمانوں میں کوئی تفریق اور انتشار پیدا کیا۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور عملی قوتوں کو کسی بے نتیجہ کام میں ضائع نہیں کیا۔ ان کا نفع ہر ضرر سے خالی، ان کی دعوت ہر خطرہ سے پاک اور ان کا کام ہر شبہ سے بالاتر ہے۔ عالم اسلام نے اپنا کچھ کھوئے بغیر ان سے نفع حاصل کیا، اور مسلمان ان کی مخلصانہ خدمات کے ہمیشہ شکرگزار رہیں گے۔

ایک ایسے نازک وقت میں عالم اسلام کے نازک ترین مقام ہندوستان میں جو ذہنی و سیاسی کشمکش کا خاص میدان بنا ہوا تھا، مرزا غلام احمد صاحب اپنی دعوت اور تحریک کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ وہ عالم اسلام کے حقیقی مسائل و مشکلات اور وقت کے اصلاحی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں، علم و قلم کی طاقت ایک ہی موضوع اور مسئلہ پر مرکوز کر دیتے ہیں۔ وہ مسئلہ کیا ہے ۔۔۔؟
۔۔۔ "وفات مسیح اور مسیح موعود کا دعویٰ" ۔۔۔ اس مسئلہ سے جو کچھ وقت بچتا ہے۔ وہ حرمت جہاد اور حکومت وقت کی وفاداری اور اخلاص کی دعوت کے نذر ہو جاتا ہے۔ ربع صدی کی تصنیفی، علمی زندگی اور جدوجہد کا موضوع اور ان کی دلچسپیوں کا مرکز یہی مسئلہ اور اس کے سلسلہ میں مخالفین سے نبرد آزمائی اور معرکہ آرائی ہے۔ اگر ان کی تصنیفات سے ان مضامین کو خارج کر دیا جائے جو حیات مسیح و نزول مسیح اور ان کے دعاوی اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل و مباحث سے متعلق ہیں۔ تو ان کے تصنیفی کارنامہ

کی مادی اہمیت اور وسعت ختم ہو جائے گی۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس عالمِ اسلام میں جو پہلے سے مذہبی اختلافات اور دینی نزاعات کا شکار تھا۔ اور جس پر اب کسی نئے نزاع کے برداشت کرنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ نبوت کا علم بلند کرتے ہیں اور جو اس پر ایمان نہ لائے۔ اس کی تکفیر کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے اور مسلمانوں کے درمیان ایک آہنی ناقابلِ عبور دیوار کھڑی کر دیتے ہیں جس کے ایک جانب ان کے متبعین کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے جو چند ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ دوسری طرف پورا عالم اسلام ہے۔ جو مراکش سے چین تک پھیلا ہوا ہے۔ اور جس میں عظیم ترین افراد، صالح ترین جماعتیں اور مفید ترین ادارے ہیں۔ اس طرح انہوں نے عالم اسلام میں بلا ضرورت ایک ایسا انتشار اور ایک ایسی نئی تقسیم پیدا کر دی جس نے مسلمانوں کی مشکلات میں ایک نیا اضافہ اور عصر حاضر کے مسائل میں نئی پیچیدگی پیدا کر دی۔

مرزا غلام احمد صاحب نے درحقیقت اسلام کے علمی و دینی ذخیرہ میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کیا، جس کے لئے اصلاح و تجدید کی تاریخ ان کی معترف اور مسلمانوں کی نسل جدید ان کی شکر گزار ہو۔ انہوں نے نہ تو کوئی عمومی دینی خدمت انجام دی جس کا نفع دنیا کے سارے مسلمانوں کو پہنچے۔ نہ وقت کے جدید مسائل میں سے کسی مسئلہ کو حل کیا۔ نہ ان کی تحریک موجودہ انسانی تہذیب کے لئے جو سخت مشکلات اور موت و حیات کی کشمکش سے دوچار ہے۔ کوئی پیغام رکھتی ہے۔ نہ اس نے یورپ اور ہندوستان کے اندر اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کی جدوجہد کا تمام تر میدان مسلمانوں کے اندر ہے۔ اور اس کا نتیجہ صرف ذہنی انتشار اور غیر ضروری مذہبی کشمکش ہے جو اس نے اسلامی معاشرے میں پیدا کر دی ہے۔ وہ اگر کسی چیز میں کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ تو صرف اس میں کہ انہوں نے اپنے خاندان اور ورثاء کے لئے سر آغا خان کے اسلاف کی طرح پیشوائی کی ایک مسند اور ایک دینی ریاست پیدا کر دی ہے۔ جس کے اقتدار کو روحانی سیادت اور مادی عیش و عشرت حاصل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں وہ ذہنی انتشار نہ ہوتا۔ جس کا پنجاب، خاص میدان تھا۔ انگریزی حکومت کے اثر سے اسلامی معاشرہ میں اسلام کی بنیادوں میں تزلزل اور اسلامی ذہن ماؤف نہ ہو چکا ہوتا۔ اگر مسلمانوں کی نئی نسل دینی تعلیمات اور اسلام کی اصلاحی و تجدیدی شخصیتوں اور نیابت انبیاء اور عظمت انسانی کی حقیقی صفات سے اتنی بے خبر نہ ہوتی اور آخر میں حکومت وقت کی پشت پناہی اور سرپرستی نہ ہوتی۔ تو یہ تحریک جس کی بنیاد زیادہ تر الہامات، خوابوں، تاویلات اور بے کیف و بے مغز نکتہ آفرینیوں پر ہے۔ اور جو عصر جدید کے لئے کوئی نیا اخلاقی و روحانی پیغام اور مسائل حاضرہ کو حل کرنے کے لئے کوئی مجتہدانہ مقام

نہیں رکھتی۔ کبھی بھی اتنی مدت باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ جیسی کہ اس بر سرِ انحطاط سوسائٹی اور اس پراگندہ دماغ پراگندہ دل نسل میں رہ سکی۔ اسلام کی صحیح تعلیمات اور دعوت سے انحراف اور ان مخلصین و مجاہدین کی (جو ماضی قریب میں اس ملک میں پیدا ہوئے اور اسلام کے عروج اور مسلمانوں کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے اپنا سب کچھ مٹا کر چلے گئے۔) ناقدری کی سزا خدا نے یہ دی کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ایک ذہنی طاعون کو مسلط کر دیا اور ایک شخص کو ان کے درمیان کھڑا کر دیا جو امت میں فساد کا مستقل بیج بو گیا ہے۔

دو سال ہوئے دمشق یونیورسٹی کے طلبہ و اساتذہ کے سامنے اسلام کی تاریخ اصلاح و تجدید کے موضوع پر ایک سلسلۂ تقریر کے دوران میں راقم سطور نے تحریک باطنیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

حضرات! میں جب باطنیت، اخوان الصفا اور ایران کی بہائی اور ہندوستان کی قادیانی تحریک کی تاریخ پڑھتا ہوں تو مجھے ایسا نظر آتا ہے۔ کہ ان تحریکوں کے بانیوں نے اسلام اور بعثت محمدی کی تاریخ پڑھی تو انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص تن تنہا جزیرۃ العرب میں ایک دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نہ مال ہے، نہ اسلحہ۔ وہ ایک عقیدہ اور ایک دین کی دعوت دیتا ہے۔ اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ ایک نئی امت، ایک نئی حکومت، ایک نئی تہذیب وجود میں آجاتی ہے۔ وہ تاریخ کا رخ تبدیل کر دیتا ہے۔ اور واقعات کا دھارا بدل دیتا ہے۔ ان کی بلند حوصلہ طبیعتوں نے ان سے کہا کہ اس کا نیا تجربہ کیوں نہ کیا جائے۔؟

انہوں نے دیکھا کہ وہ ذہانت، دماغی صلاحیت، تنظیمی لیاقت بھی رکھتے ہیں۔ اور پڑھے لکھے لوگ ہیں پھر کیوں نہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ اور کس طرح انہیں واقعات کا ظہور نہ ہوگا۔ جو طبعی اسباب اور عمل کے ماتحت گزشتہ دور میں ہو چکے ہیں۔ ان کو امید تھی۔ کہ پھر اسی معجزہ کا ظہور ہوگا جس کا تاریخ نے چھٹی صدی مسیحی میں مشاہدہ کیا۔ اس لئے کہ فطرتِ انسانی ناقابلِ تبدیل ہے۔ اور لوگوں میں ہمیشہ سے ہر دعوت قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔

ان بلند حوصلہ انسانوں نے اس یکہ و تنہا ہستی کو تو دیکھا جو بغیر کسی سرمایہ اور بغیر کسی فوجی طاقت و حمایت کے ایک دینی دعوت لے کر کھڑی ہوئی لیکن اس کے پیچھے اس ربانی حمایت اور ارادہ الٰہی کو نہیں دیکھا جو اس کی کامیابی، غلبہ اور قیامت تک باقی رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اور جس نے اعلان کر دیا تھا:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى	وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ہدایت اور سچے
وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ	دین کیساتھ تاکہ ان سب دینوں پر غالب کرے
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (الصف۔ ع ۱)	خواہ شرک کرنے والے کتنا ہی برا مانیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر ان کی کوششیں کامیاب اور بار آور ہوئیں اور انہوں نے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں اپنے ساتھی اور پیرو پیدا کر لئے۔ ان میں سے بعض نے (باطنیہ نے) عظیم الشان سلطنت (فاطمیہ) بھی قائم کر لی اور یہ سلطنت عرصہ تک پھلی پھولی اور ایک زمانہ میں اس نے سوڈان سے مراکش تک قبضہ کر لیا، لیکن جب تک ان کی تنظیم ان کے مخفی انتظامات اور ان کی شعیدہ بازیاں باقی رہیں۔ یہ عروج بھی باقی رہا لیکن پھر وقت آیا کہ یہ سب عروج و اقتدار اور یہ سب ترقی و اقبال ایک افسانہ بن کر رہ گیا۔ ان کے مذاہب ایک مختصر دائرہ میں محدود ہو کر رہ گئے۔ جن کی زندگی پر کوئی اثر اور دنیا میں کوئی مقام نہیں۔

اس کے بالمقابل اسلام جس کو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے۔ وہ آج بھی دنیا کی عظیم ترین روحانی طاقت ہے۔ اور آج اس کے ساتھ ایک عظیم الشان امت ہے۔ آج بھی وہ ایک تہذیب رکھتا ہے۔ اور بہت سی سلطنتوں اور قوموں کا مذہب ہے۔ نبوت محمدی کا آفتاب آج بھی بلند اور روشن ہے۔ اور تاریخ کے کسی دور میں بھی وہ گہن میں نہیں آیا۔

ہمیں فخر ہے کہ ہمیں عوام کو جوہری توانائی

اور

غذائیت سے بھرپور

آٹا میدہ سوجی

مہیا کرنے کی سعادت حاصل ہے

★

آپ بھی

ہمیشہ یونیورسل فلور ملز کا تیار کردہ بہترین اور اعلیٰ آٹا استعمال کریں

مینیجر — یونیورسل فلور ملز گلبہار کالونی پشاور۔ فون ۴۰۴۰

مرزا غلام احمد کے ایک شعر پر تضمین

صاحبزادہ محمد حنیف اللہ صدیقی قاسمی
گمبٹ ضلع خیرپور میرس

سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ آپ کا رسالہ الحق چونکہ مرزائیت کے خلاف جہاد اکبر کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اس لئے میں اپنی ایک نظم فارسی جو میں نے آنجہانی مرزا صاحب کے ایک مشہور شعر ؎ کربلائیست سیر ہر آنم صد حسین است در گریبانم کے جواب میں لکھا ہے اور جسکو رئیس امروہی نے معیاری قرار دیا ہے، بھیج رہا ہوں نظم یہ ہے:

گرچہ مدح حسین نتوانم — سگ ابلیس از درش رانم
کو بصد کبر بہر خود گفتہ — کربلائیست سیر ہر آنم
اے خبیث ارچنیں نہ می گفتی — کربلائیست فرحت جانم
بہ بلائے چوں توئی ز نسل یزید — قاتل شاہ دین و ہم عالم
در گریبان خود تو گر نگری — طوق لعنت بگردنت دانم
ذات خود را تو گر نمی دانی — پرسس از من کہ من ترا دانم
چوں توئی کلب جارح پنجم — زان ترا کلب او ہمی خوانم
چوں توئی کور ظاہر و باطن — چون ضیائی حسین بنمائیم
رونق عالم از جہاد حسین — دین باقی ازو درین عالم
عاصی بینوا ہمیں گوید — باد قربان بشاہ دین جانم
بار الٰہا۔ حنیف می گوید — خادم آل پاک گردانم

زیڈال

نے

یورپ والوں کا دعوٰی

غلط

ثابت کر دیا

زیڈال سے انٹرویو

ہفتوں ، مہینوں ، سالوں نہیں بلکہ گھنٹوں اور دنوں میں

گنج پر بال

گرتے بالوں کو فوراً روکتا ہے

زیڈال

۱ — بل روڈ

لاہور

اُندلس
کے ایک متمول گھرانے کا
کتب خانہ

احمد خان۔ ایم اے (عربی دلائبریری سائنس)
ادارہ تحقیقات اسلامی۔ اسلام آباد

چوتھی صدی ہجری میں اندلس کے تقریباً ہر شہر میں علماء کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ اور ان کے شخصی کتب خانے بھی تھے، مگر قرطبہ اس لحاظ سے تمام شہروں میں سبقت لے گیا تھا، کیونکہ یہاں کئی علمی گھرانے آباد تھے، جن کے اپنے کتب خانے برسوں سے قائم تھے۔ یہاں کے اہل علم وفضل اور متمول گھرانوں میں بنو فطیس کا مقام سب سے اونچا تھا۔ یہ خاندان قرطبہ کی سیاست میں بھی کافی دخیل تھا یہاں تک کہ الحکم ثانی المستنصر (ابتدائے حکومت ۳۵۰ھ - ۳۶۶ھ) جس وقت سریر سلطنت پر بیٹھے تو ایک عام اجتماع میں اسی خاندان کے ایک فرد نے بادشاہ کے قائم مقام کی حیثیت سے تمام لوگوں سے بیعت لی[1] علم وفضل میں بھی اس خاندان کے لوگوں نے بہت نام پیدا کیا۔ ان میں عبدالرحمٰن بن محمد بن عیسیٰ بن فطیس کا نام سرفہرست ہے۔ تمول و دولت کی بدولت اس خاندان نے قرطبہ میں اپنی رہائش کیلئے الگ ایک محلہ "درب فطیس" کے نام سے برسوں سے آباد کر رکھا تھا جسکا ہر مکان اسی خاندان کی ملکیت تھا۔ اپنی ایک شاندار مسجد تھی، اس سے ملحقہ ایک عظیم عمارت تھی جس میں علمی پیاس بجھانے کیلئے ایک عمدہ کتب خانہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ عمارت خاص طور پر اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھی۔

یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کتب خانے کی بنیاد کب رکھی گئی، تاہم اتنا واضح ہے کہ ابوالمطرف عبدالرحمٰن بن محمد کے عہد میں یہ کتب خانہ اپنی شانِ جلالت کے اعتبار سے قرطبہ کے تمام کتب خانوں سے بڑا تھا۔ اس کتب خانے کی تفصیل میں جانے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے آخری مالک

---

(۱) المقری : نفح الطیب۔ ط لیڈن۔ ج ۱، ص ۲۵۱

جس کے عہد میں اسے چار چاند لگے ہیں، کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لی جائیں۔ تاکہ ہم پر یہ بات پوری طرح منکشف ہو سکے کہ صاحب کتب خانہ کس علو مرتبت کا حامل تھا۔ کیونکہ اس سے اندازہ لگا کر کتب خانے کے بارے میں کافی حد تک صحیح رائے قائم کی جا سکے گی۔

صاحب کتب خانہ | عبدالرحمٰن بن محمد بن عیسیٰ بن فطیس بن اصبغ بن فطیس قرطبہ میں ۳۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ صاحب ابوالمطرف کنیت رکھتے تھے۔ اس زمانے کے مروجہ تعلیم کے مطابق علم حدیث بہت جلد حاصل کر لیا۔ اس مقصد کیلئے اندلس کے مختلف شہروں میں کبار محدثین سے استفادہ کیا۔ وقت کے دستور کے مطابق جن حضرات سے حدیث سنی ان سے ساری روایات لکھ بھی لیں۔ علاوہ بریں ابوالمطرف نے ان حضرات سے بھی اکتساب علم کیا جو مشرقی ممالک سے قرطبہ میں وارد ہوئے تھے۔ بہت جلد ہی ان کے علم اور صلابت فی الحق کا شہرہ شاہ وقت تک پہنچا۔ وزراء ان سے مشورے لینے لگے۔ چنانچہ انہیں شرطہ اور محکمۂ مظالم سپرد کیا گیا جسے وہ خوش اسلوبی سے چلاتے رہے[۳]۔ علم حدیث کے حصول میں اس قدر انہماک اور توجہ سے کام لیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں بہت اونچے مقام پر فائز ہو گئے۔ یہاں تک کہ علماء ان سے استفادہ کرنے لگے۔ ان کی علمیت کے بارے میں ابن بشکوال رقمطراز ہیں:-

كان من جهابذة المحدثين وكبار العلماء والمسندين حافظاً للحديث وعلله، منسوباً الى فهمه واتقانه، عارفاً باسماء رجاله ونقلته ببصر المعدلين منهم والمجرحين، له عناية كاملة بتقييد السنن والاحاديث المشهورة والحكايات المسندة، جامعاً لها، مجتهداً في سماعها وروايتها۔[۴]

ابوالمطرف نہ صرف حدیث کے ماہر تھے بلکہ اس سے متعلق کئی اور علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ کتاب الصلۃ ہی میں ہے:

وله مشاركة في سائر العلوم وتقدم في معرفة الآثار والسير والاخبار[۵]

احادیث کی کتب نہ صرف پڑھیں۔ بلکہ کافی تگ و دو کے ساتھ جمع بھی کرتے رہے۔

۲۔ ابن بشکوال، کتاب الصلۃ۔ ط القاہرۃ ۱۹۵۵ء ج ۱ ص ۲۹۸

۳۔ ایضاً: ص ۲۹۹

۴۔ ایضاً: ص ۲۹۸ ۵۔ ایضاً

حدیث کے پڑھانے کا کام انہوں نے اپنی مسجد میں کیا ہے۔ یہاں بہت سے لوگ استفادے کیلئے جمع ہوجاتے۔ انہیں یہ صاحب زبانی درسِ حدیث دیتے مگر وہ لوگ یہ سب کچھ احاطۂ تحریر میں لے آتے۔ ابو علی الغسانی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالمطرف حدیث لکھوا رہے ہوتے اور لوگ بیٹھے لکھ رہے ہوتے تھے۔ علم حدیث میں شہرت کا یہ عالم تھا کہ مکہ مکرمہ، بغداد اور قیروان کے علماء نے بعض مسائل کی افہام و تفہیم کی غرض سے ابوالمطرف سے خط و کتابت کی ہے۔[۶] ان کے تبحر علمی کی بدولت ہی حکومت کی طرف سے انہیں قرطبہ کے ایک گروہ کا قاضی مقرر کیا گیا۔ اور ساتھ ہی جمعہ کی نماز اور خطبہ بھی ان کے سپرد ہوا۔ کہتے ہیں یہ دونوں عمل بیک قرطبہ میں کسی قاضی میں جمع نہیں ہوسکے۔ یہ شرف صرف انہی صاحب کو حاصل ہوا ہے۔ یہ خدمت ان کے ذمے ابوالمظفر عبدالملک بن ابی عامر کے قرطبہ میں گورنری کے ایام میں سپرد ہوئی تھی۔ ان تمام کاموں میں سب سے بڑھ کر جس سرکاری کام کو سرانجام دے رہے تھے وہ وزارت علیا میں شرطہ اور مظالم کے فرائض تھے جن کا اوپر ذکر ہوچکا ہے۔

یہ صاحب طبیعت کے اعتبار سے اگرچہ کافی سخت تھے۔ اور حکومت کے انتظامی امور میں کافی ممد و معاون ہوسکتے تھے مگر تھے علمی شخصیت اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد سب سیاسی جھنجھٹوں سے ہاتھ جھاڑ کر علمی و دینی کاموں کے ہو رہے ہے[۷] اور صرف درس و تدریس اور جمعہ کا خطبہ دیتے رہے۔ بالآخر وہ صاحب علم و فضل عظیم محدث اور محب کتب، قرطبہ میں بربروں کے

۶ۃ ایضاً ۷ۃ النباہی: تاریخ قضاۃ الاندلس۔ ط القاہرۃ۔ دارالکاتب المصری، ۱۹۴۸ء۔ ص ۸۷

۸ۃ النباہی (متوفی ۷۹۳ھ) نے لکھا ہے کہ جب ان صاحب کو قضا اور نماز کا کام سونپا گیا تو با اوصاف ہونے کے باوجود اس عمل پر قائم نہ رہ سکے اور استقامت، استقلال کا مظاہرہ نہ کرسکے۔ اس لئے کہ جس شخص کی جگہ انہیں مقرر کیا گیا تھا۔ وہ (ابن ذکوان) ان سے کہیں زیادہ اچھے تھے۔ اسی لئے لوگوں کو کافی افسوس ہوا۔ چنانچہ نو ماہ کے بعد معزول کر دیئے گئے۔ دیکھئے النباہی: تاریخ قضاۃ الاندلس۔ ص ۸۶

داخلے کے وقت نصف ذی القعدۃ ۴۰۲ھ میں انتقال کر گئے، انہیں اپنی مسجد کے قریب خاندانی قبرستان میں اسی روز سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کی نمازِ جنازہ ان کے بیٹے ابوعبداللہ محمد نے پڑھائی تھی۔ انہوں نے علومِ قرآن و حدیث اور تاریخ میں کافی تصانیف چھوڑی ہیں۔ جن کی فہرست تراجم کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں [۹]

کتب خانہ | جس عہد میں عبدالرحمٰن ابن قطلیس نے آنکھیں کھولیں۔ اس وقت قرطبہ کی گلی گلی میں کتب خانے قائم ہو چکے تھے۔ لوگ خاندانی وجاہت، شکوہ اور علمی فضیلت کے اظہار کی خاطر بھی کتب خانے قائم کرتے تھے۔ ان کا کتب خانہ اگرچہ ابا و اجداد سے چلا آرہا تھا مگر وہ اس قدر توجہ کا مرکز نہ بن سکا جس قدر کہ ان صاحبِ علم و دولت کی زندگی میں اسے دھیان دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ یہ صاحب علمی اعتبار سے مروجہ اقدار کے مطابق علم سے پوری طرح بہرہ ور تھے۔ ان کی شہرت تقریباً تمام مسلم ممالک میں پھیل چکی تھی۔ پھر اللہ کا فضل بھی تھا کافی مال و دولت کے مالک تھے۔ طبیعت نے بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ عام اصول و دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم کی تحصیل کے دوران انہوں نے احادیث کی بہت سی کتابیں اپنے ہاتھ سے نقل کر لی تھیں۔ علاوہ بریں تمام عمر حدیث لکھ کر اس سے علمی خدمت سرانجام دیتے رہے۔ [۱۰]

اللہ نے انہیں عمدہ خط ودیعت کیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ کتاب کو باقاعدہ صحیح ترین شکل میں لکھنے کے عادی تھے۔ اپنے ہاں کتابیں بڑھانے اور ان کی تعداد میں کئی گنا اضافہ کرنے میں اکثر بڑھ چڑھ کر مستعدی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ حدیث کی تعلیم زبانی دیتے۔ مگر طلباء و علماء کو حکم دیتے کہ لکھ لیا کریں۔ ابن بشکوال نے اس امر کا ذکر یوں کیا ہے:

وکان یملی الحدیث من حفظہ فی مسجدہ و مستملی بین یدیہ علی ما یفعلہ کبار المحدثین بالمشرق والناس یکتبون عنہ۔ [۱۱]

یہ متفقہ امر ہے کہ یہ صاحب مشرق یعنی شمالی افریقہ اور جزیرہ نما عرب میں نہیں آئے۔ مگر ان کا طریق تدریس بالکل مشرقیوں جیسا تھا۔ انہی کے مطابق لوگ قلم و دوات کے ساتھ مسجد

۹۔ ابن بشکوال: کتاب الصلۃ۔ ج ۱ ص ۲۹۹ — ۳۰۰

۱۰۔ ایضاً۔ ص ۳۰۰

۱۱۔ ایضاً: ص ۲۹۸

میں حاضر ہوتے اور شیخ الحدیث کے تمام لیکچر لکھ لیا کرتے تھے۔

اتنے بڑے اہم اور علمی کام کی سرانجام دہی میں جو چیز ابن فطیس کو امداد بہم پہنچا رہی تھی وہ ان کا خاندانی کتب خانہ تھا جس میں اس کے اپنے ہاتھ کی نقل کردہ اور دیگر مشاہیر کی لکھی ہوئی کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ تھا۔

کتب خانہ کی عمارت | درب بنی فطیس کا یہ محلہ قرطبہ کے اہم محلوں میں شمار ہوتا تھا جس میں یہ علمی وسیاسی خاندان برسوں سے رہائش پذیر تھا۔ یہاں انہوں نے محلے کی تمام ضروریات مہیا کر رکھی تھیں جن میں مساجد حمام اور دیگر عوامی ضروریات کی چیزیں میسر تھیں۔ ان میں اس خاندان کی ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے قریب ہی ایک مسجد تھی۔ اسی مسجد سے متصل ان کے کتب خانے کی عمارت تھی، جو خاص طور پر اسی مقصد کیلئے بنائی گئی تھی۔ اس کتب خانے کی عمارت کی تعمیر میں یہ بات مدنظر رکھی گئی تھی۔ کہ ایک خاص جگہ سے کتب خانے کی ساری کتابیں بیک وقت نظر آسکیں۔ چونکہ یہ عمارت بہت بڑی تھی۔ اس لئے اس امر کا نبھانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس دشواری کے باوجود ان حضرات کے ذوق جمال اور کتابوں سے محبت نے اس عمارت کو نہ صرف مناسب اور عمدہ بنایا بلکہ کافی جاذب نظر بھی تھی۔ پتہ نہیں طبی نقطۂ نظر سے یا کسی اور وجہ سے ابو المطرف نے اس عمارت کیلئے سبز رنگ پسند کیا تھا۔

چنانچہ انہوں نے کتب خانے کی پوری عمارت اندر سے اسی رنگ میں رنگ دی تھی۔ یہاں تک کہ دروازے، کھڑکیاں اور چھتیں بھی سبز کر دی گئی تھیں۔ کتب خانے میں قارئین کیلئے رکھا ہوا فرنیچر، فرش، پردے، گدے اور تکیے وغیرہ سبھی اس رنگ میں تھے۔ ابو الحسن علی بن عبداللہ النباہی نے ابو المطرف کے کتب خانے کی عمارت کی یوں تفصیل دی ہے:

وكان بداره مجلس عجيب الصنعة، حسن الآلات، ملبس كله بالخضرة جدرانه وابوابه وسقفه وفرشه وستوره ونمارقه۔ وكل ذلك متشاكل الصفات۔ قد ملأه بدفاتر العلم ودواوين الكتب التي ينظر فيها ويخرج منها۔ وبهذا المجلس كان انسه وخلوته۔ [12]

یوں تو یہ تفصیل اس قدر اچھی اور عمدہ تو معلوم نہ ہوتی ہوگی، مگر اتنی تفصیل کا ان ادوار میں تراجم کی کتابوں میں وارد ہونا۔ اس امر کی بین دلیل ہے کہ یہ امر اپنی اہمیت اور قدر و منزلت کے اعتبار سے اس مقام

---

[12] النباہی: تاریخ قضاۃ الاندلس - ص ۸۸

پر تھا کہ ابو المطرف کے سوانح نگاروں نے اس کتب خانے کی عمارت کو خاص طور پر بیان کیا، جبکہ بڑے بڑے جید علماء کی زندگیوں کے حالات صرف چند سطور سے آگے نہیں بڑھ سکے ... اس عمارت کی اہمیت اور توصیف میں جو کلمات کہے گئے ہیں اس قدر الفاظ تو بڑے بڑے شاہی کتب خانوں کی عمارتوں کو بھی میسر نہیں آ سکے۔ یہ سب اس کتب خانے کی بڑائی کی عمدہ سند ہے۔

اس دور میں طباعت کتب اور ان کا پھیلاؤ اس قدر آسان نہ تھا جس قدر آج ہے کتابوں کے اصل نسخوں کا حصول، پھر ان کی نقلوں کی تیاری میں بہت سی دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ کاغذ کا حصول بھی ناممکن کی حد تک تھا۔ اور اگر کہیں ملتا تو اس کی قیمت بہت زیادہ ہوتی تھی۔ اس دور کے حالات پڑھتے وقت ان مشکلات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

ابو المطرف، جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا ہے، ساری عمر کتابیں پڑھنے، لکھنے اور دوسروں کی کتابیں نقل کرنے میں لگے رہے۔ ان کا خط بہت عمدہ تھا۔ اور جو کچھ لکھتے تھے۔ اس کو باقاعدہ ضبط کیا کرتے تھے[13] اسی لئے ان کی نقل کردہ کتابیں صحت اور درستی کے اعتبار سے بہت عمدہ سمجھی جاتی تھیں۔

ان کے کتب خانے میں کتابیں صرف حدیث پر ہی نہ تھیں جس طرح کہ عام طور پہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی صاحب محدث ہوتے تو ان کے ہاں صرف حدیث کی کتابیں، اگر کوئی عالم ادیب ہوتا تو صرف شعر و ادب سے متعلق کتابیں اپنے کتب خانے میں رکھتا۔ مگر اس کے برعکس ابو المطرف جو ساری عمر حدیث کی خدمت کرتا رہا، اسے پڑھتا پڑھاتا رہا، اسی علم میں نظر عمیق پیدا کرنے کی خاطر اس نے اس وقت کے مروجہ تقریباً تمام علوم کی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ یہ کتابیں صرف ان علوم کی بنیادی کتابوں پہ ہی مشتمل نہ تھیں بلکہ اپنے فن اور مقدار کے اعتبار سے ابو المطرف کا کتب خانہ اس وقت کے کتب خانوں سے گوئے سبقت لے گیا تھا۔ چنانچہ اس کی سوانح حیات لکھنے والے سبھی حضرات متفقہ طور پر اس بات کے قائل ہیں کہ:

وله مشاركة في سائر العلوم وجمع من الكتب في انواع العلم مالم يجمعه احدٌ من اهل عصره بالاندلس۔[14]

---

[13] ابن بشکوال: کتاب الصلۃ۔ ج ۱۔ ص ۲۹۸۔
[14] ابن فرحون الیعمری: کتاب الدیباج المذہب فی معرفۃ اعیان علماء المذہب۔ ط مصر ۱۳۵۱ھ۔ ص ۱۵۰۔ ابن بشکوال: کتاب الصلۃ۔ ج ۱۔ ص ۲۹۸۔

ان کی وہ عظیم عمارت ایسی ایسی عمدہ کتابوں سے بھری ہوئی تھی، جیسا کہ النباھی نے اوپر بتایا ہے:
قد ملا بہ فاتر العلم و دواوین الکتب۔

اس دور میں نادر اور مشاہیر کی تحریر کردہ کتابیں جس کتب خانے میں پائی جاتی اس کیلئے ان کا وجود قابل فخر سمجھا جاتا تھا۔ لوگ ایسی کتابوں کے حصول میں ہر دم کوشاں و سرگرداں رہتے تھے۔ چنانچہ ابوالمطرف کو جب کہیں اپنے مقرر کردہ آدمیوں کی معرفت یا کسی اور ذریعے سے اس امر کا علم ہوتا کہ فلاں عالم کے پاس کسی کتاب کا نادر نسخہ ہے یا بہت عمدہ تحریر کردہ ہے تو وہ پہلے تو اس نسخے کو خریدنے کی سرتوڑ کوشش کرتے۔ کئی گنا قیمت بڑھانا تو ایک عام بات تھی۔ اس شخص کو منہ مانگے دام دینے پر بھی رضامند ہو جایا کرتے تھے۔ اور اگر کسی طور بھی وہ صاحب اس کتاب کو بیچنے پر رضامند نہ ہوتے تو اس کو کسی اور واسطے سے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ اگر پھر بھی کامیاب نہ ہوتے تو کم از کم اس کتاب کی نقل حاصل کرنے یا دوسرے نسخوں سے اس کا مقابلہ کرنے کی اجازت تو ضرور حاصل کر لیتے تھے۔[۱۵] کتب خانے میں نئی نئی اور نادر الوجود کتابوں کے اضافے کیلئے کئی وراق ملازم رکھے ہوتے تھے۔ جو دن رات کام کر کے کتابوں میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔

عملہ: اگرچہ یہ کتب خانہ برس ہا برس سے اس خاندان کے مختلف لوگوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اور انہوں نے اسے بنانے میں اپنی ہمتیں صرف کیں ہیں۔ مگر خود ابوالمطرف نے ساری عمر اس کیلئے کام کیا ہے۔ ان کا دستور یہ تھا کہ علماء کو حدیث لکھواتے تھے۔ تو لقیناً اس کے نسخے اپنے ہاں بھی محفوظ کرتے تھے۔ مگر ان سے بڑھ کر یہ کہ یہ صاحب خود بھی کتب خانے میں بیٹھ کر کتابیں نقل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے چھ وراق باقاعدہ ملازم رکھے ہوئے تھے۔ جنہیں حسب مراتب معقول تنخواہیں دی جاتی تھیں۔ تاکہ وہ اطمینان سے یکسو ہو کر کام کر سکیں اور عجلت کی وجہ سے جو اغلاط اور اسقام رہ جاتے ہیں ان کا خدشہ نہ رہے۔[۱۶]

کسی کتب خانے کی عظمت کا اندازہ لگانے کیلئے اس کے عملے کی طرف بھی دیکھا جاتا ہے اگر عمدہ قسم کے لوگ، عالم و فاضل اور کافی پڑھے لکھے ہوں تو اس کتب خانے کے سٹاک اور علو مرتبت کی دلالت ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ابوالمطرف خود اس کتب خانے میں کام کرتے تھے۔ جن کا علم وفضل

---

[۱۵] ابن بشکوال: کتاب الصلۃ ج ۱۔ ص ۲۹۹۔ فکر و نظر (ماہنامہ) جنوری ۱۹۷۳ء ص ۵۱۴

[۱۶] ایضاً

اوپر بیان ہو چکا ہے ۔ ان کے ہاں کام کرنے والوں میں سے سب کا علم تو نہیں ہو سکا ، البتہ ایک صاحب کا پتہ چلتا ہے ۔ یہ صاحب ابو عبداللہ محمد بن عیسٰی بن محمد بن معلی بن ابو ثور الحضرمی (۳۲۱ھ ـــ ۳۹۶ھ) تھے ۔

یہ صاحب دراصل تھے تو لبسط کے باشندے مگر قرطبہ میں اگر سکونت پذیر ہو گئے تھے ۔ یہاں آنے سے قبل انہوں نے مروجہ علوم میں درک حاصل کر لیا تھا ۔ اسی طرح بڑے بڑے جید علماء سے کسب فیض بھی کر چکے تھے ۔ ان کے بارے میں ابن بشکوال رقمطراز ہیں :۔

وکانت لہ عنایۃ کثیرۃ لسماع العلم وتقییدہ وروایتہ وکان رجلاً صالحاً ۔ وکان حسن الخط ، جید الضبط ۔ وکان ینسخ للقاضی ابی المطرف بن فطیس ، کتبہ ویقید مقالہ ۔ [۱۷]

یہ صاحب جب پہلے پہل قرطبہ میں آئے تو درب بنی فطیس ہی میں سکونت اختیار کی اسی محلہ کی مسجد میں ابو المطرف نے انہیں امام مقرر کر دیا ۔ اور ان سے حدیث وغیرہ بھی سنیں ۔ اسی وجہ سے انہیں یہاں کے لوگوں میں ایک مقام حاصل ہو گیا ۔ ابن فطیس اپنی کتابوں میں جہاں کہیں حدثنا الحضرمی کہتے ہیں تو اس سے مراد ان کے یہ امام ہوتے ہیں ۔ [۱۸]

ان کا خط بہت عمدہ تھا پوری صحت کے ساتھ کتابیں نقل کرتے ۔ ابو المطرف کی مختلف مواقع پر کی گئی تقاریر بھی ضبط تحریر میں لایا کرتے تھے ۔ اس کتب خانے میں یہ صاحب کتابوں کی فہرست بنانے اور خاص واہم کتابوں کی نقلیں تیار کرنے کا کام کرتے تھے ۔ [۱۹]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو المطرف نے اپنے عملے میں کتنے عمدہ قسم کے فضلاء جمع کر رکھے تھے ۔ علاوہ بریں انہوں نے اپنے عملے میں کام کی تقسیم پورے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اور عملے کی لیاقت و استعداد کے مطابق کر رکھی تھی ۔

کتب خانے کی خدمات | چوتھی صدی ہجری میں یہ تصور کرنا کہ کسی شخص کا کتب خانہ عوام کیلئے آج کی طرح کافی ضرورتیں پوری کر رہا ہو گا ، ایسا خیال تو بالکل غیر مناسب ہے ۔ تاہم جو کام اس وقت کے وقف کتب خانے کرتے تھے ۔ تقریباً اس کے برابر خدمات یہ کتب خانہ بھی سرانجام دے رہا تھا ۔ چونکہ اس خاندان کے سبھی حضرات اس محلے میں مقیم تھے اس لئے اجتماعی طور پر انہوں نے عوامی ضروریات

---

[۱۷] ابن بشکوال : کتاب الصلۃ ۔ ج ۲ ۔ ص ۵٦۴ — [۱۸] ایضاً ج ۲ ۔ ص ۵۷۴

[۱۹] فکر و نظر (ماہنامہ) جنوری ۱۹۷۳ء ۔ ص ۱۵۴ ۔

کی جگہیں قائم کر رکھی تھیں جن میں مسجد، درس و تدریس کیلئے مدرسہ اور یہ کتب خانہ ان میں شامل تھے۔ چنانچہ وہ سب اس کتب خانے سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ باہر سے آنے والے علماء اور طلاب علم بھی اس سے برابر کام میں لاتے تھے۔

کتابوں کے ضیاع کے پیش نظر انہیں ہر ایک کو مستعار نہ دینے کے بارے میں ابو المطرف کے پوتے ابو سلیمان ہمیں بتاتے ہیں کہ:

ان القاضی جدہ کان لا یعیر کتابا من اصولہ البتۃ۔ [30]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاص اور اہم کتابیں جو اصول کا درجہ رکھتی تھیں۔ انہیں تو وہ مستعار کسی کو بھی نہیں دیتے تھے۔ البتہ دوسری قسم کی کتابیں خاص خاص آدمیوں کو دے دیتے تھے۔۔۔۔ ایسی کتابیں جن کے حصول میں ان صاحب نے بہت تکالیف اٹھائی ہیں۔ یا جنہیں حاصل کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ ان کے حصول میں کامیابی کے بعد ان کے ضائع ہو جانے کے خدشہ کے تحت کسی کو مستعار دینے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ اسی طرح اصول کی کتابیں بھی حتی الامکان مستعار نہیں دیتے تھے۔ مگر ایسی کتابوں کے بارے میں بھی کوئی صاحب بضد ہوتے اور انہیں مستعار لینے پر مجبور کرتے تو ابو المطرف اس کتاب کو کتب خانے کے عملے سے بہت تھوڑے وقت میں دوسرا نسخہ نقل کروا دیتے۔ یہی نہیں بلکہ اصل کے ساتھ باقاعدہ مقابلہ بھی کروا دیتے۔

یہ سب صرف اس لئے کرتے تھے تاکہ اصل نسخہ محفوظ رہے۔ کیونکہ انہیں اس امر کا تلخ تجربہ تھا کہ مستعار لینے والا کتاب کو شاذ و نادر ہی واپس کرتا ہے۔ یہ بات تو عام ہے کہ کتابیں مستعار لینے والے اکثر بھول جاتے ہیں یا جان بوجھ کر اسے نہیں لوٹاتے۔ اس بات سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ کتابیں عوام کو مستعار دیتے تو تھے مگر اہم و خاص کتابوں کے اصل نسخے دینے کی بجائے نقل کروا دیتے تھے۔ [31]
اگر وہ صاحب مستعار لی ہوئی کتاب واپس کر دیتے تو فبہا ورنہ وہ منقول نسخہ اسے ہی عطا کر دیتے تھے۔ ان کے حسن سلوک سے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ کتب خانوں میں آج کل قارئین کی سہولت کیلئے فوٹو گرافی اور دیگر نقول دینے کیلئے جو خدمات سرانجام دی جاتی ہیں وہ اس وقت بھی ابو المطرف اپنے کتب خانے میں قارئین حضرات کیلئے مہیا کئے ہوئے تھے۔

---

۳۰ ابن بشکوال: کتاب الصلۃ۔ ج ۱۔ ص ۲۹۹

۳۱ ایضاً و فکر و نظر (ماہنامہ) جنوری ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۵۱

کتب خانے کا انجام | عروس البلاد قرطبہ بارہا اجڑا اور بسا۔ کئی علمی خزینے برباد ہوتے رہے اور پھر بنتے رہے۔ مگر بعض دفعہ ایسے حالات بھی پیش آئے کہ جو کتب خانے برباد ہوئے ان جیسے کتب خانے اس کے بعد کے ادوار میں نہ بن سکے۔ سیاسی زیر و بم اور ملکی بے ثباتی نے اکثر کتب خانے ختم کئے ہیں۔ ایسے حالات ہی میں ابوالمطرف کا کتب خانہ بھی ختم ہو گیا۔

بربریوں نے جب اندلس میں طوائف الملوکی کو ختم کرنے کیلئے اقدام کئے تو ان حالات میں عوام کی بے چینی میں خاصا اضافہ ہوا کیونکہ علمی و ثقافتی زندگی تقریباً معطل ہو گئی۔ چیزوں کی قیمتیں بے ہنگم طریقے سے قائم ہونے لگیں۔ لوگ گھروں میں محبوس رہنے لگے اور معاش کے ذرائع مسدود ہو گئے تو بنو فطیس کے حالات بھی کافی متاثر ہوئے۔ رمق حیات کو قائم رکھنے کی خاطر ابوالمطرف کی وفات (۴۰۲ھ) کے بعد یہ علمی خاندان اپنے اباؤ اجداد کے اس عظیم و بیش بہا ورثے کو بیچنے پر مجبور ہو گیا۔ جس جگہ ابوالمطرف درس و تدریس اور کتب لکھوانے کا کام کیا کرتا تھا۔ اسی مسجد میں یہ لاثانی ذخیرہ لاکر ڈھیر کر دیا گیا۔ اور پھر قسط وار نیلام ہوتا رہا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ابوالمطرف کی جمع کردہ کتابیں صحت اور ضبط تحریر کے اعتبار سے بہت اونچی تھیں۔ انہوں نے کئی کتابوں کے اصول جمع کر رکھے تھے۔ اسی اہمیت کی بدولت انہیں خریدنے کیلئے قرطبہ کا بہت بڑا حصہ ٹوٹ پڑا ہوگا۔ اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا ہوگا۔ مگر اس بے چینی اور بے ثباتی کے عالم میں یہ ذخیرہ ایک سال تک اس مسجد میں پڑا رہا۔ اور تقریباً قرطبہ کے سبھی باشندے اس کی خریداری کیلئے آتے رہے۔ ابوالمطرف کے پوتے ابوسلیمان نے اپنے چچے اور خاندان کے کئی دیگر افراد سے سنا کہ:

ان اهل قرطبة اجتمعوا لبيع كتب جده هذا مدة عام كامل في مسجده في الفتنة في الغلاء، وانه اجتمع فيها من الثمن اربعون الف دينار قاسمية۔ [۲۲]

اس طرح اس خاندان کو اس وقت کے چالیس ہزار سونے کے سکے (دینار قاسمیہ) حاصل ہوئے۔ ابن فرحون کے اندازے کے مطابق اس کے عہد میں یہ رقم اٹھ لاکھ دیناروں کے برابر تھی [۲۳]

---

[۲۲] ابن بشکوال: کتاب الصلۃ ج ۱ ص ۲۹۹

[۲۳] ابن فرحون: کتاب الدیباج المذہب ص ۱۵۰

تفسیر اور علم تفسیر

جناب نور محمد غفاری ایم اے

قسط (۲)

الغرض ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر اور تاویل دونوں ایسے علم ہیں جو قرآنی معارف کی شرح و ایضاح کے لئے ضروری ہے۔ اور دونوں میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ تفسیر کا لفظ سارے قرآن کی تشریح پر بولا جا سکتا ہے۔ اور تاویل صرف متشابہات کی قبیل سے متعلق آیات کی وضاحت پر یا بعض آیات کے باطنی مفہوم کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر کا نام "تاویل" رکھا ہے۔ مثلاً ابن قتیبہؒ متوفی ۲۷۶ھ کی "تاویل مشکل القرآن" اور ابو منصور ماتریدیؒ متوفی ۳۳۳ھ کی "تاویلات قرآن" وغیرہ۔ تو اس کا جواب نہایت سہل ہے کہ "تاویل" کا لفظ غالباً تیسری چوتھی صدی ہجری تک تشریح قرآن کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ کیونکہ اس مدت تک عربی زبان کا غلبہ رہا۔ اور ویسے بھی تبع تابعینؒ کا زمانہ نہایت قریب ہی گزرا تھا۔ لہٰذا تقریباً تمام امت مسلمہ قرآنی الفاظ اور عبارت کا مفہوم بآسانی سمجھ لیتی تھی۔ لہٰذا مفسرین حضرات صرف مشکل القرآن اور غریب الفاظ یا متشابہات کی تفسیر پر زور دیا کرتے تھے۔ اور یہ وہ آیات اور الفاظ تھے جن میں ظاہری مفہوم کی بجائے باطنی مفہوم بتانا مقصود تھا۔ لہٰذا مفسرین حضرات نے اپنی تشریحات کو "تاویل یا تاویلات" کا نام دیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت ثابت کرنے کے لئے جو دلائل دیئے جائیں گے، انہیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ نقلی دلائل ۲۔ عقلی دلائل

۱۔ نقلی دلائل | انہیں ہم آگے مندرجہ ذیل حصوں میں بانٹ لیتے ہیں۔

ا۔ تفسیر کی ضرورت اور تاکید قرآن حکیم کی روشنی میں۔

ب۔ تفسیر کی اہمیت و فضیلت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

ج۔ تعامل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

د۔ تعامل علماء امت کی روشنی میں۔

ا۔ قرآن مجید کی روشنی میں :۔۔۔ کتاب اللہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی تشریح و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ذمہ داریوں میں سے ایک تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہارگانہ فرائض نبوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔

(آل عمران : ۱۶۴)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر بہت بڑا احسان کیا۔ کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیات سناتا ہے ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان فرائض میں ایک "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" اب تعلیم نام صرف الفاظ کے پڑھ دینے کا نہیں۔ بلکہ تشریح اور تفسیر کا ہے ـــــ دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔

(نحل : ۴۴)

ہم نے (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس بات کی وضاحت کریں جو انکی طرف نازل کی گئی ہے۔

یہ "تبیین کلام" تشریح و توضیح کا ہی دوسرا نام ہے ـــــ ایک اور مقام پر فرمایا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔

(نساء : ۱۰۵)

ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان خدا کی رہنمائی میں فیصلہ کریں۔

حاصل کلام : قرآن مجید نے بتایا کہ کتاب اللہ کی تفسیر ضروری ہے۔

ب :۔ حدیث شریف کی روشنی میں ـــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی تفسیر

اپنے قول و فعل دونوں سے فرما کر دکھائی اور امت کو تفسیر کا حکم بھی دیا۔ اور فضیلت بتا کر ترغیب بھی دلائی۔ مثلاً

۱۔ سورہ "حدید" اور اسکی تفسیر سیکھو۔ (بحوالہ الاتقان نوع ۷۸)

۲۔ حضرت ضحاکؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قولہ تعالیٰ: "یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ" سے قرآن کا عطا کرنا مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: "قرآن کا عطا کرنا سے قرآن کی تفسیر مراد ہے۔ کیونکہ پڑھنے کو تو نیک و بد سبھی پڑھتے ہیں۔"

۳۔ بیہقی وغیرہ نے سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "قرآن مجید کی تعریب (تفسیر) کرو۔ اور اس کے غریب اور نامانوس الفاظ کی تلاش میں سرگرم رہو۔"

۴۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاْوِیْلَ۔ اے اللہ! اسے دین کی فقاہت بخش اور تاویل کا علم عطا فرما۔

تفسیر گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت کی پیروی کرنا ہے۔

ج:۔ تعامل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پھر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں بھی تفسیر قرآن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے مختلف مقامات پر باقاعدہ حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ مثلاً مدینہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگردؒ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے تلامذہ راشدہؒ اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کلام اللہ مجید کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو تفسیر کرنے کا حکم اور ترغیب دی مثلاً:

۱۔ حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "جو شخص قرآن شریف پڑھتا ہے۔ اور اس کی تفسیر اچھی طرح نہیں کر سکتا اس کی مثال اس اعرابی کی ہے۔ جو شعر کو بے سوچے سمجھے اور غیر موزوں پڑھتا ہے۔ (فضائل القرآن لابوذر الھروی)

۲۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "بیشک مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں قرآن کی کسی ایک آیت کی تعریب (تفسیر و توضیح) کروں۔ بہ نسبت اس بات کے کہ میں ایک آیت حفظ کر لوں۔" (عن الانباری)

اگر کاوش سے کام لیا جائے تو اور بہت اقوال ان حضراتؓ کے مل سکتے ہیں۔

د۔ تعامل علماء امت : صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور ان کے بعد پھر ہر دور میں تفسیر کا عمل برابر جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ علماء نے اپنے عمل اور تحریر دونوں سے یہ بات ثابت کر دی کہ تفسیر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کے بغیر قرآن کا فہم ممکن نہیں۔ اسی لئے علماء نے تفسیر کرنے کو واجب علی الکفایہ کا درجہ دیا ہے۔

علماء نے بڑی بڑی تفاسیر تصنیف کی ہیں۔ مثلاً امام رازیؒ کی "مفاتیح الغیب"، تفسیر طبری، تفسیر "حدائق ذات البہجہ" وغیرہ ان میں سے "تفسیر صدائق ذات البہجہ" کے پانچ سو (۵۰۰) اجزاء ہیں۔

۲۔ عقلی دلائل | ا۔ حضرۃ امام ابن تیمیہؒ کی دلیل :— فرماتے ہیں : "اس بات کی تشریح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو ایسی زبان سے مخاطب کیا ہے جس کو وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور اسی لئے پروردگار عالم نے ہر ایک رسولؑ کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے۔ اور اپنی کتاب کو بھی اپنی قوموں کی زبان میں نازل فرمایا ہے۔ پھر رہی یہ بات کہ اب تفسیر کی حاجت کیوں رہی؟ تو اس کا جواب ایک قاعدہ کی قرار داد کے بعد دیا جائے گا۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو شخص کتاب تصنیف کرتا ہے، وہ صرف خود ہی سمجھنے کے لئے تصنیف کرتا ہے۔ اور اس کی کوئی شرح نہیں کرتا۔ لیکن اس کتاب کی شرح کی حاجت تین وجوہ سے پڑتی ہے۔

اوّل :۔ ان میں سے پہلی بات مصنّف کی فضیلت کا کمال ہے کہ وہ علمی قوت کی وجہ سے وجیز لفظوں میں دقیق معنی کو جمع کر دیتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات مصنّف کی مراد کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں شرح سے ان مخفی معنوں کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے جو اپنی تصانیف کی شروح خود ہی لکھی ہیں، وہ بہ نسبت ان شروح کے جو دوسرے لوگوں نے لکھی ہیں، بہت زیادہ مراد پر دلالت کرنے والی ہیں۔

دوم :۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنّف اپنی کتاب میں چند مسائل کی وضاحت کے لئے کچھ مزید باتیں اور شرطیں اس خیال سے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ امور اور شروط واضح چیزیں ہیں یا ان کو درج نہیں کرتا کہ ان چیزوں کا تعلق کسی دوسرے علم سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی حالتوں میں شرح کرنے والے کو امر محذوف اور اس کے مراتب کے بیان کی حاجت پیش آتی ہے۔

سوم :۔ تیسری بات یہ ہے کہ لفظ میں کئی معنوں کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ مجاز، اشتراک اور دلالت التزام کی صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ اور ان صورتوں میں شارح پر لازم ہے۔ کہ وہ مصنّف کی غرض کو بیان کرے اور اسے دوسرے معنوں پر ترجیح دے۔

ان تین باتوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بشری تصانیف میں وہ باتیں بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ جن سے کوئی بشر خالی نہیں۔ مثلاً تسامح، تکرار اور اسی نوع کے دیگر نقائص۔ لہٰذا شارح کو ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ مصنف کی ان لغزشوں کا بھی اظہار کر دے۔

اب جب یہ بات ٹھیک قرار پاگئی، تو اب ہم کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کا نزول محض عربی زبان میں ہوا اور عربی بھی کس دور کی۔؟ افصح العرب کے زمانے کی زبان! پھر ان لوگوں کو بھی قرآن کے ظاہر امور اور احکام ہی کا علم ہوتا تھا۔ لیکن اس کے اندرونی مفہوم کی باریکیاں ان پر اسی وقت منکشف ہوتی تھیں جب وہ بحث و تمحیص سے کام لیتے یا غور و خوض کرتے تھے۔ اور اکثر باتوں کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کرتے تھے۔ مثلاً جس وقت خداوند اقدس کا یہ ارشاد گرامی نازل ہوا۔ وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ۔ نازل ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا۔ (یعنی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔) اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ کریمہ کے لفظ "ظلم" کی تفسیر "شرک" کے ساتھ فرمائی اور اسی پر دوسری آیت: "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" کو بطور دلیل کے پیش کیا۔ یا جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے "حِسَابًا يَسِيرًا" کی بابت سوال کیا تھا کہ وہ کیا ہے۔؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ "عرض" (یعنی اعمال کا صرف پیش کرنا) ہے۔ اور جیسے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا قصہ "الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ" کے متعلق ہوا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی دوسری باتیں ہیں۔ جنہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک ایک کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا۔

اور ہم لوگ بھی ان باتوں کے محتاج ہیں، جن کے محتاج حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ علاوہ ازیں ہمیں احکام ظواہر میں سے بھی ایسے امور کے علم کی احتیاج ان حضرات رضی اللہ عنہم کو ہرگز نہ تھی اور ہماری اس احتیاج کا سبب ہمارا بغیر سیکھے ہوئے احکام لغت کے مدارک (فہم) سے قاصر ہونا ہے۔ لہٰذا ہم کو تمام لوگوں سے بڑھ کر تفسیر کی ضرورت اور حاجت ہے۔

اور یہ بات بھی محتاج بیان نہیں کہ قرآن شریف کے بعض حصہ کی تفسیر صرف وجیز الفاظ کی شرح کرنے اور یہ بات ان کے معنی کو منکشف کر دینے سے ہو جاتی ہے۔ اور بعض مقامات کی تفسیر چند احتمالات میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے ہوتی ہے۔ (بحوالہ الاتقان۔ نوع ۷۸)

۲۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تمام اشخاص یکساں فہم و فراست، تفکر و تدبر اور صلاحیت و قابلیت کے نہیں ہوتے۔ کوئی کچھ فہم ہے تو کوئی زود فہم اور کوئی ذکی ہے ——— تو کوئی بالکل غبی۔

اس وجہ سے کسی بات یا کلام کو سمجھنے میں ہر ایک یکساں نہیں ہوتا۔ پھر عام لوگوں کا کلام تو الگ رہا جب معاملہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا ہو جسکی جامعیت، بسط، ہمہ گیری اور وسعت کا کچھ ٹھکانہ نہیں جس میں بیشمار مطالب، فصاحت و بلاغت، اوصاف کلام اور معنی و بدیع کا ایک چمن کھلا ہوا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے کلام کی تشریح و تفسیر ایک ضروری چیز ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

۳۔ پھر قرآن ایک پہلو سے اصول و کلیات کی کتاب ہے۔ جس میں جزئیات نگاری سے کام نہیں لیا گیا۔ اور نہ ہی اس میں فروعی باتوں کو کھپانے کا اہتمام کیا گیا ہے ——— ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان اصول و کلیات کی تشریح اور جزئیات و تفصیلات کی تبیین و تفسیر ضروری ہو جاتی ہے۔ پھر قوانین و احکام کی تفصیلی صورت، حدود و قیود اور ان کا اطلاق واضح طور پر متعین ہونا چاہئے۔ اور اس ضرورت کو تفسیر پورا کرتی ہے۔

الغرض، مندرجہ بالا عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کس قدر ضروری ہے۔ اس کے ذریعے ہی ہمیں اس کتاب مقدس کا فہم حاصل ہوگا۔ جس میں ہماری دنیوی و اخروی فوز و فلاح کا راز پنہاں ہے۔

ہماری مصنوعات
★ ڈی۔ ڈی۔ ٹی
★ ہائیڈرو کلورک ایسڈ
★ پیرا ڈائی کلورو بنزین
ملک کی مصنوعات کی سرپرستی کیجئے
منجانب :- ڈی۔ ڈی۔ ٹی فیکٹری
نوشہرہ

جدید زبانوں کے عربی مآخذ

محترم جناب مظفر عباسی — (مری)

۲

لفظ ایک زبان سے ہجرت کر کے دوسری زبان میں جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے، اور اسکی صورت کس طرح مسخ کی جاتی ہے؟ اس کا اندازہ عربی کے لفظ "امیر" سے کیا جا سکتا ہے۔

امیر امیر عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں صاحب امر یعنی حاکم، انچارج، نگران وغیرہ چونکہ صاحب امر یعنی حاکم مال و دولت کا مالک بھی ہوتا ہے۔ اس نسبت سے اردو میں امیر مالدار کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا، یعنی اردو والوں نے لفظ کے مفہوم میں تبدیلی یا تخصیص کی ہے۔ اسکی صورت مسخ نہیں کی۔ البتہ اہل یورپ نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

مسلمان یورپ میں سپین کے راستے گئے تھے۔ اور سپین فتح کرنے کیلئے مسلمانوں نے بحر روم کو عبور کیا تھا۔ گویا مسلمانوں کی بحری فوج نے سپین فتح کیا۔ اور اسی فوج کے مجاہد فرانس میں پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان مجاہدوں کا سپہ سالار بحری فوج کا کمانڈر "امیر البحر" کہلاتا تھا۔ اہل فرانس نے "امیر البحر" کی اصطلاح اپنائی اور اس سے "بحر" حذف کر دیا۔ "بحر" کا لفظ حذف کرنے کے بعد انہیں صرف امیر کا لفظ اپنانا چاہئے تھا۔ لیکن عربی زبان سے واقف نہ ہونے کے باعث انہوں نے "بحر" کے شروع میں واقع "ال" امیر کے ساتھ جوڑ کر "امیرال" بنا لیا اور اس طرح فرانسیسی زبان میں بحری فوج کے نگران کو AMIRAL (امیرال) کہا جانے لگا۔ فرانسیسیوں سے انگریزوں نے یہ لفظ اپنایا۔ تو انہوں نے شروع شروع میں صرف اہل فرانس کی نقل پر اکتفا کیا اور AMIRAL (امیرال) ہی بولتے اور لکھتے رہے۔ چنانچہ پرانی انگریزی میں یہی لفظ ملتا ہے۔ بعد میں اسکی صورت مسخ کر کے اسے ADMIRAL (ایڈمرال) بنا دیا اور آج کل بحری فوج کے

نگران یا صاحب امر کے لئے ADMIRAL (ایڈمیرال) مستعمل ہے۔

غور فرمایا آپ نے کہ فرانس والوں نے لفظ کی صورت اس طرح بدلی کہ "بحر" کے شروع میں کلمہ تعریف یعنی "ال" واقع تھا اسے اپنی ناسمجھی کے باعث "امیر" کے آخر میں جوڑ دیا۔ اور "امیر" کو "امیرال" بنا ڈالا۔ اور فرانس والوں سے انگلینڈ والوں نے جب یہ کلمہ مستعار لیا۔ تو اس میں "ایڈ" کا اضافہ کر کے ایڈمیرال (ADMIRAL) بنا دیا۔

معنوی اعتبار سے بھی تحریف کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ "امیرال" یا "ایڈمیرال" ہر قسم کے نگران، سردار، یا صاحب امر کے لئے نہیں بلکہ صرف بحری فوج کے نگران اعلیٰ کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ حالانکہ جب لفظ بحر حذف کر دیا تھا۔ تو اس لفظ کی عمومیت باقی رہنی چاہیئے تھی۔ اور نہ صرف فوج بلکہ ہر شعبہ کے نگران کو "امیر" یا "ایڈمیرال" کہنا چاہیئے تھا۔

جبل الطارق | سپین، امیر البحر، اور مسلمانوں کی بحری فوج کے ذکر سے ایک اور لفظ یاد آیا جسکی اہل یورپ نے صورت مسخ کر کے ایک مثال اور نمونہ فراہم کیا ہے۔ یہ ہے "جبل الطارق" پرانے اندلس اور موجودہ سپین کے جنوبی ساحل پر ایک شہر آباد ہے، جس کا نام GIBRALTAR (جبرالٹر) ہے، یہ عربی الفاظ جبل" اور "طارق" کا مرکب ہے۔ یعنی طارق کا پہاڑ۔ یہ وہ پہاڑی مقام ہے جہاں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں مسلمانوں کی بحری فوج نے سرزمین اندلس میں پہلی چھاؤنی لگائی تھی۔

اہل یورپ نے "جبل الطارق" کی صورت مسخ کر کے اسے GIBRALTAR (جبرالٹر) بنا لیا ہے۔ یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ لفظ عربی کے جبل الطارق سے لیا ہے، لیکن کسی قاعدے قانون کی نشاندہی نہیں کر سکتے جس کے مطابق "جبل" کو "جبرال" اور "طارق" کو "ٹر" بنا لیا ہے۔

غالباً "امیر البحر" کی طرح "جبل الطارق" میں "الطارق" سے "ال" جبل کے ساتھ لگا لیا گیا ہے۔ اور جبل کے "ل" کو "ر" سے بدل ڈالا ہے۔ اس طرح جبل "جبرال" بن گیا۔ باقی رہا "طارق" سو اس کا "ق" حذف کر کے "طار" باقی رکھا۔ جو تلفظ میں TAR یعنی ٹار اور پھر ٹر" بن گیا۔

"ل" اور "ر" (L اور R) کا آپس میں ایک دوسرے سے بدل جانے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ خود عربی میں "سیر" اور "سیل" دو لفظ ہیں جن میں "ر" اور "ل" کا فرق ہے۔ اور معنی کم و بیش ایک ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں "سیر" کا اسم فاعل "سیلانی" مستعمل ہے۔ اگر "ر" اور "ل" آپس میں نہ بدلتے تو یا "سیر" کا اسم فاعل "سیرانی" ہوتا یا سیلانی کا مادہ "سیل" ہوتا۔

حشیش | حشیش عربی میں بھنگ کو کہتے ہیں۔ بھنگ نشہ آور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ